# شہیدِ آزادی
# سید احمد شہید

پروفیسر عتیق احمد صدیقی

۱۹۴۷ء میں ہندوستانی عوام نے غیر ملکی تسلط اور غلامی سے نجات حاصل کر کے آزادی کی فضا میں سانس لینا شروع کیا یہ پرامن انقلاب تھا جو ۱۹۴۷ء میں وقوع پذیر ہوا۔ انتقال اقتدارات کا عمل بغیر خون خرابے کے پورا ہوگیا۔ لیکن یہ کامیابی نہ ایک دن میں حاصل ہوئی، نہ قربانی کے بغیر۔ اور دنیا کا کون سا بڑا مقصد ہے جو بڑی قربانیوں کے بغیر حاصل ہوا ہو۔

اس بظاہر پرامن انقلاب کے پیچھے قربانیوں کی ایک طویل داستان ہے۔ ہندوستانی عوام نے غیر ملکی استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک عرصے تک جدوجہد کی استخلاص وطن کے لیے بڑی سے بڑی قربانیوں سے دریغ نہیں کیا۔ جابر و مستبد قوتوں کے سامنے سر جھکانے کے بجائے سر کٹانے کو ترجیح دی۔ ہزار ہا لوگوں نے خوشی خوشی پھانسی کے پھندوں کو چوم لیا سنسناتی ہوئی گولیوں کے سامنے سینہ سپر ہوگئے اور جہاد آزادی کی شمع کو اپنے خون سے روشن کرتے رہے۔

جنگ آزادی کا وہ حصہ جو بیسویں صدی سے متعلق ہے خون آلود نہیں ہے اس دور میں عوام اداران سے زیادہ خواص مغلوبیت کا شکار ہو چکے ہیں۔ اقتدار میں شرکت کے مطالبے کے ساتھ آئینی حدود کے اندر رہ کر خود اختیاری اور آزادی کے مطالبات کیے جا رہے ہیں جابر قوتوں کی خوں آشامی بھی ختم ہو چکی ہے۔ صرف یہ نہیں کہ بین الاقوامی طور پر ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے جن میں خون ریزی کی عالمی سطح پر مذمت کی جانے لگی تھی جبکہ یورپی ممالک میں

میں ایسی کشمکش شروع ہو چکی تھی کہ کوئی بھی حکومت اپنے ملک میں یا اپنی نوآبادیات میں خلفشار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اور اس سے بھی زیادہ سچ یہ ہے کہ خون مشرق کی ارزانی نے ان کی پیاس کو ختم کر دیا تھا اور حریت پسندوں کو دبانے اور کچلنے کے لیے صرف قید و بند کی سزاؤں کو ہی کافی سمجھا جانے لگا تھا۔ لیکن انیسویں اور اٹھارویں صدی کی جدوجہد کی داستان خون سے رنگین ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کو پہلی جنگ آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن ایسا کہنا اس سے پہلے کی تاریخ کو نظر کر دینے کے مترادف ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ آخری مسلح مقاومتی جنگ تھی۔ جس میں شکست کھانے کے بعد اہل ہند کے حوصلے پست ہو گئے آخری مغل تاجدار کو قید کر کے جلاوطن کر دیا گیا اور مغل سلطنت کے تابوت میں آخری کیل ٹھوک دی گئی۔ مغل سلطنت اور مغل حکمران جن کو ابھی تک برطانوی حکمران ایک آڑ کے طور پر استعمال کر رہے تھے اور جو ابھی تک اہل ہند کے لیے مرکزیت کا نشان تھے۔ منظر سے ہٹا دیے گئے۔ وحشت و بربریت کا ننگا ناچ ہوا اور برطانوی استبداد نے وہ مظالم ڈھائے کہ چشم آسمان نے اس کی مثال کم دیکھی ہوگی جائیدادیں ضبط ہوئیں، حویلیاں ڈھائی گئیں، بستیاں برباد کر دی گئیں، چوراہوں پر سولیاں گاڑ دی گئیں اور ہزارہا لوگوں کو پھانسی دے دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ پھانسی پانے والوں میں صرف علما کی تعداد دس ہزار سے متجاوز تھی۔ ۱۸۵۷ء کے اس محاربہ کو اس لیے بھی زیادہ اہمیت حاصل ہوئی کہ اس وقت ہندوستان کی بہت سی چھوٹی بڑی قوتیں ایک فیصلہ کن جنگ کے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ اور اس ناکامی کے بعد ان کے پاس یاس و حسرت کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن تاریخ پر نظر ڈالیے تو ۱۸۵۷ء تک اہل ہند کو غیر ملکی تسلط کے خلاف لڑتے لڑتے ایک صدی گزر چکی تھی۔ یہ درست ہے کہ ان جنگوں کی حیثیت علاقائی تھی لیکن خود انگریزوں کے اثرات بھی علاقائی تھے، جن سے باہر یا تو وہ تاجر تھے یا ہندوستانی ریاستوں کی آڑ میں مطلب ستائی کر رہے تھے۔ مگر بعض عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ علاقائیت چند روزہ ہے اور اگر ان بڑھتے ہوئے اثرات کو نہ روکا گیا تو یہ عنقریب دھیرے دھیرے ساری چھوٹی بڑی ریاستوں کو نگل جائے گا۔

سراج الدولہ کی طرف سے پہلی منظم کوشش تھی کہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار ان کے ظلم و تعدی اور ان کے استحصال کو روک دیا جائے اور وہ بنگال میں اپنی حاکمیت قائم نہ کرسکیں۔ لیکن عیاری اور لالچ کا بُرا ہو کہ اس کے بہت سے امرا انگریزی رشوتوں کا شکار ہو گئے، میر بخشی، میر جعفر، حاکم کلکتہ مانک چند، امی چند، جگت سیٹھ وغیرہ نے دغا کی اور سراج الدولہ کو پلاسی کے میدان میں ۱۷۵۷ء میں شکست ہوئی۔ اس فتح کے بعد انگریزوں کو نہ صرف کروڑہا کروڑ روپے لوٹ کھسوٹ میں حاصل ہوئے بلکہ ان کے لیے شمالی ہند کا مشرقی دروازہ کھل گیا۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شکست نے جنوبی محاذ کو صاف کر دیا۔ اس شہید حریت کی خون آلودہ لاش کو دیکھا تو انگریز افسر خوشی سے چلا اٹھے "آج ہندوستان ہمارا ہے"۔

۱۸۰۰ء میں انگریز فوجوں نے دہلی پر یلغار کی تو دہلی کی حفاظت کے لیے مرہٹے سینہ سپر ہو گئے لیکن تمام قوتوں کو شکست دے کر لارڈ لیک کی ماتحتی میں ان فوجوں نے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کر لیا۔ پیشوا کو اس سے پہلے ہی دبا کر معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ جس کی رو سے انگریزوں کی ایک فوج اس کے علاقہ میں رہنے لگی تھی۔ سیندھیا کی فوجوں کو دہلی میں شکست ہو گئی امیر علی خان اور ہلکر انگریزی اقتدار پر برابر ضرب لگا رہے تھے، ان کو بھی کمزور کر دیا گیا۔ مگر اس وقت نہ بادشاہ کو معزول کیا گیا، نہ تاج و تخت چھینا گیا، نہ ہندو مسلمانوں کے معاشرتی اور مذہبی امور میں مداخلت کی گئی بلکہ ہندوؤں کے سماجی معاملات پنڈتوں کے اور مسلمانوں کے معاشرتی معاملات قاضیوں کے سپرد کر دیے گئے۔ بس کاروبار حکومت کے اختیارات جو ہندو یا مسلمان امرا اور وزرا کے سپرد ہوتے تھے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے تسلیم کرا لیے گئے اسی کی تعبیر وہ فقرہ تھا جو اس دور کے پورے نظام کی تصویر پیش کرتا ہے۔ یعنی "خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا"۔ اس صورت حال سے اہل قلعہ نے بھی سمجھوتہ کر لیا تھا اور عوام الناس نے بھی، خواص کے بعض طبقوں کو بھی مذہب، تہذیب اور بادشاہ کے محفوظ ہونے کے پیش نظر عافیت مصالحت میں ہی نظر آنے لگی تھی، لیکن بعض دور اندیش حضرات جن کی دوربین نگاہیں مستقبل کی پرچھائیوں کو دیکھ رہی تھیں، سخت مضطرب تھے اور بے بسی کے ساتھ شدید ہیجان میں مبتلا تھے۔ اسی دور میں شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز کا وہ مشہور فتویٰ شائع ہوا جس میں ہندوستان کو دارالحرب قرار

دیا گیا۔ ان فتاویٰ کے بارے میں مولانا سید محمد میاں رقمطراز ہیں :

"فتویٰ کی زبان مذہبی ہے کہ "دارالحرب" کا اصطلاحی لفظ استعمال کیا گیا، مگر رُوح سیاسی ہے اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ

(۱) قانون سازی کے جملہ اختیارات عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

(۲) مذہب کا احترام ختم ہے۔

(۳) اور شہری آزادی سلب کر لی گئی ہے۔

لہذا ہر محبِ وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلان جنگ کرے اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کر دے۔ اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لیے حرام جانے"[۱۲]

اس فتوے کا اثر کیا ہوا یہ بھی مولانا ہی کی زبانی سنیے :

"عام مسلمان جو انگریزوں کے تیز رفتار اقتدار سے حیرت میں رہ گئے تھے اور اپنے اندر ایسی صلاحیت نہیں رکھتے تھے کہ مذہب کی روشنی میں فیصلہ کرسکیں کہ اس اقتدار کے مقابلے میں ان کا طرزِ عمل کیا ہو، ان کے لیے ایک راستہ کھل گیا جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ باہمت جنگ جو طبقہ جا بجا اس طاقت سے وابستہ ہو گیا جو اس وقت انگریزوں سے برسرِ پیکار تھی۔ یہ طاقت اس وقت صرف مرہٹوں کی تھی۔

چنانچہ اس دور میں مسلمانوں اور مرہٹوں کی پرانی جنگ ختم ہو گئی اور صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ مرہٹی علاقوں کے مسلمان مرہٹوں کی فوج میں شامل ہو کر آخر تک انگریزوں سے لڑتے رہے بلکہ شمالی ہند کے بھی بہت سے مسلمان ان علاقوں میں پہنچے اور مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں کی جنگ میں شریک ہو گئے خود حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے خاص معتقد اور مرید سید احمد صاحب کو امیر علی خان سنبھلی کے پاس بھیجا جو جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ ایک عرصہ سے انگریزی طاقت پر شب خون مار رہے تھے"[۱۳]

یہ گویا شاہ صاحب کے فتوے کی عملی تعبیر کا آغاز تھا۔ جس کو انجام تک پہنچانے کی کوشش میں سید احمد صاحب نے اپنے بہت سے جانباز ساتھیوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔

سید احمد رائے بریلی میں ۲۹ر نومبر ۱۷۸۶ء کو پیدا ہوئے[۱۴] اُن کا خاندان اپنے تقدس اور

بزرگی کے اعتبار سے پورے اودھ میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن بچپن میں وہ رسمی تعلیم کی طرف متوجہ نہ ہوسکے صرف قرآن شریف کو ذوق وشوق سے پڑھا اور اسی سے اُن کے دماغ میں یہ بات بیٹھی:

"انسان دنیا میں ذاتی اغراض میں پھنسے رہنے اور ذاتی نفع کو ملحوظ رکھنے کے لیے پیدا نہیں ہوا بلکہ منشائے الٰہی انسان کی پیدائش سے صرف یہ ہے کہ وہ بنی نوع کی خدمت کرے اور خدا کی مخلوق کی بہتر اور ترقی دینے میں جمیل کوشش عمل میں لائے۔"[۵]

سترہ برس کے ہوئے تو والد کا انتقال ہوگیا۔ تلاش معاش میں لکھنؤ پہنچے مگر وہاں کے معاشرتی حالات سے نالاں ہوکر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور دہلی پہنچ کر شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہاں کم وبیش دو سال رہے اسی دوران شاہ صاحب سے ظاہری اور باطنی کمالات حاصل کیے اور پھر وہاں اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق امیر علی خاں کے لشکر میں شامل ہوگئے۔ یہ گویا اُن کی پر جوش اور سپاہیانہ طبیعت کی تسکین کا سامان اور ان کی پہلی جنگی تربیت گاہ تھی۔ خانقاہی زندگی سے جنگ آزمائی کے لیے کیوں بھیج دیے گئے؟ دہلی پر انگریزی اقتدار قائم ہو چکا جس کے خلاف جہاد کرنا شاہ عبدالعزیز کے نزدیک فرض عین تھا۔ اسی کے لیے انھوں نے سید صاحب کو تیار کیا تھا۔ امیر علی خاں نے معمولی سپاہی کی حیثیت سے زندگی شروع کی لیکن دھیرے دھیرے اس نے اپنی فوج تیار کرلی تھی۔ وہ جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف مورچے لے رہی تھی۔ ان کے ساتھ شامل ہونا گویا ایک مذہبی فریضہ کو ادا کرنا تھا سید صاحب نے وہاں رہ کر نہ صرف عملی جنگ کا تجربہ کیا اور جنگی تدبیروں سے واقفیت حاصل کی بلکہ پورے لشکر میں اصلاح وتبلیغ کا کام بھی جاری رکھا لیکن جب ۱۸۱۸ء میں امیر علی خاں کو انگریزوں سے صلح کرنے پر مجبور ہونا پڑا تو سید صاحب ان کا لشکر چھوڑ کر دہلی آگئے بلکہ ایک آزمودہ کار سپاہی بھی تھے۔ اسی دوران شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل اور داماد مولانا عبدالحیٔ نے سید احمد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ دونوں حضرات اپنے دور کے عالم اجل اور خطیب بے بدل علوم دینی وعقلی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے گو سید صاحب کے رسمی علم کی تلافی ان حضرات کی شرکت

سے ہوتا تھی ۔ یہ بیعت صرف اخلاقی و روحانی نہیں تھی بلکہ یہ ایک انقلاب آفرین پروگرام کا آغاز تھا بقول مولانا محمد میاں :

"حضرت سید احمد کی زیر قیادت ایک گروپ بنایا گیا مولانا عبدالحئی اور مولانا اسمٰعیل صاحب اس گروپ کے اہم ترین رکن اور سید صاحب کے مشیر خاص قرار دیے گئے ان تینوں حضرات کو سب کمیٹی کے سپرد کیا گیا کہ :

(ا) ملک میں دورہ کرکے روح انقلاب پیدا کریں

(ب) رضاکار بھرتی کریں ۔ ان کو فوجی ٹریننگ دیں ۔

(ج) مالیہ فراہم کریں ۔ (د) دیگر ممالک سے تعلقات پیدا کریں ۔

(ہ) فوجی کارروائی ۔ باضابطہ جنگ" ۵ے

ان مقاصد کے حصول کے لیے پچیس افراد پر مشتمل قافلہ ۱۸۱۸ء میں دہلی سے روانہ ہوا ان آزادی کے پروانوں کے پاس دنیاوی اسباب میں سے کچھ نہ تھا لیکن خدا پر کامل یقین ، مقصد کی سچی لگن ضبط و تحمل اور قربانی و ایثار کی بے پناہ دولت ان کے پاس تھی ۔ یہ دورے ملک و بیرون ملک سات سال تک جاری رہے اور ، لوگ آتے رہے اور قافلہ بنتا گیا ۔ عبیداللہ سندھی نے ان دوروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلا دورہ بیعت طریقت کے لیے ۔ دین کی فہم اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ کی تلقین اس کا خاص مقصد تھا یہ دورہ ۱۸۱۹ء میں ختم ہوگیا اور دوسرا دورہ بیعت جہاد کے لیے ہوا ۔ ان دوروں میں طرح طرح کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا جسمانی مشقتوں سے لے کر فاقہ کشی تک کی تکلیفیں اٹھانی پڑیں ۔ مگر جن لوگوں نے ایک مرتبہ بیعت کی وہ ان سب کو خوشی خوشی جھیلتے رہے مریدوں کے حلقے میں ذکر و مراقبے کے بجائے فنون حرب کی مشق ہونے لگی سید صاحب فرماتے تھے :

"جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے ، ہتھیار لگاؤ ، پیٹ بھر کر کھاؤ اور اسلحہ کے استعمال کی مشق کرو ، اس سے بہتر کوئی فقیری اور درویشی نہیں" ۔

اسی دوران اپنے مرشد کی ہدایت پر آٹھ سو ساتھیوں کے ہمراہ حج بیت اللہ کے لیے بھی گئے یہ ایک دینی فریضہ تو تھا ہی لیکن اس کے اور بھی بہت سے مقاصد و مصالح تھے :

(۱) اس خیال باطل کی عملی تردید کہ اہل ہند سے فریضہ حج ساقط ہوچکا ہے۔

(۲) جماعتی تنظیم کی عملی تربیت

(۳) ایک ایسی جماعت کی تربیت جو عقیدتاً اور عملاً اسلامی سانچے میں ڈھل چکی تاکہ انقلاب انھیں کے ہاتھوں برپا ہو۔

(۴) یورپی طاقتیں نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کو نرغہ میں لے کر روند رہی تھیں ان کے خلاف ایشیائی قوتوں کو مجتمع کرنے کی کوشش

فریضہ حج ادا کرنے کے بعد ۱۸۲۴ء میں اپنے وطن پہنچے اس دوران ہزار ہا لوگوں نے بیعت کی۔ اس سے پورے شمالی ہند میں اخلاقی و سماجی بیداری کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری اور انقلاب کی داغ بیل پڑ گئی جو لوگ اب تک بے حسی کے ساتھ حالات کا شکار تھے اب ان کو محسوس کرنے لگے جو بے بسی کے ساتھ ان کو دیکھ رہے تھے، کچھ کرنے کی لگن سے بے تاب ہو گئے ناامیدی امید سے اور پست ہمتی حوصلہ مندی سے بدلنے لگی، شاہ ولی اللہ نے جس مکمل انقلاب کا نظریہ پیش کیا تھا، اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہر طرح کی جانی و مالی قربانی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ جگہ جگہ ایسے افراد پیدا ہو گئے جنھوں نے تحریک انقلاب کی زمام اپنے ہاتھ میں لی اور اس طرح کلکتہ سے دہلی، بلکہ پشاور تک انقلاب پسندوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ یہ نری جھم جوئی یا اقتدار پسندی نہیں تھی۔ اس لیے اصلاح نفوس و اصلاح معاشرت کا عمل بھی جاری تھا۔ اس دوران جو فضا پیدا ہو گئی تھی اس کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں:

"پہلے جو چیز خواب و خیال تھی اب ان کو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی، جس میں انھوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اصلاحی جھنڈا گاڑتے اور صلیب کو انگریزوں کی لاشوں کے نیچے دفن کرتے ہوئے دیکھا ہے"

یہ سب زمین ہموار ہو جانے اور کسی حد تک سامان و حرب و ضرب بہم پہنچ جانے کے بعد مسئلہ یہ تھا کہ آغاز کار کہاں سے ہو۔ کوئی ایسا مقام نقطہ آغاز نہیں ہو سکتا تھا جہاں ہر طرف اغیار سے گھر جائیں کمک نہ پہنچ سکے، راستے مسدود ہو جائیں۔ کامیابی کی صورت یہ نظر آتی تھی کہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے علاقہ کو اپنا مستقر اور خروج کا مرکز بنایا جائے۔ یہ علاقہ کئی وجوہ کی بناء پر عسکری اہمیت

کا حامل تھا۔ دور تک مسلم ریاستوں کا سلسلہ تھا، جن سے بڑی امداد ملنے کی توقع تھی۔ خود اس علاقہ کی آبادی ایسے قبائل پر مشتمل تھی جن کی حریت پسندی ضرب المثل تھی۔ لیکن پنجاب کی سکھ حکومت کے ہاتھوں ان کا ناک میں دم تھا پھر بھی وہ آپس میں ہی ایک دوسرے سے برسرپیکار رہنے کی وجہ سے اپنی قوتوں کو ضائع کرتے رہتے تھے ان کو متحد و منظم کرکے ایک ایسی عسکری قوت حاصل ہو سکتی تھی جس کے ذریعہ استخلاص وطن کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا تھا۔

زماں شاہ نے اٹھارویں صدی کے آخر میں ہندوستان پر یلغار کرکے پنجاب کے میدانوں کو روند ڈالا تھا۔ اس کے طوفان کو روکنا نہ مرہٹوں کے بس کی بات تھی، نہ تخت دہلی کی۔ اس کے قدم ایک بار دہلی میں جمتے تو انگریزوں کی پیش قدمی کے امکانات معدوم ہو جاتے لیکن اسی دوران افغانستان میں خانہ جنگی شروع کرا دی گئی اور زماں شاہ کو واپس جانا پڑا۔ وہ ۱۷۹۹ء میں واپس جاتے ہوئے رنجیت سنگھ کو پنجاب کی گورنری کا پروانہ لکھ کر دے گیا تھا۔ اس کے زوال کے بعد رنجیت سنگھ نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ارد گرد کی چھوٹی چھوٹی سکھ اور مسلم ریاستوں کو ختم کرکے بڑی سلطنت قائم کی اور مہاراجہ کا لقب اختیار کیا، انگریزوں نے اس حکومت کو اپنا حلیف بنا لیا اور اپنی تدبیر گری سے سکھوں کو پہلے سندھیا کے مقابلہ پر کھڑا کرکے مرہٹہ قوت کو کمزور کرایا اور پھر سکھ حکومت کا رخ شمال کے پٹھانوں کی طرف موڑ دیا تاکہ خود انگریز شمال مغرب کے خطرے سے بے نیاز ہو کر مفتوحہ علاقوں میں اپنی حکومت کو مستحکم کر سکیں۔

حریت پسندوں کے اس قافلے کا پنجاب سے گزر کر سرحدی علاقہ تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے راجستھان کے طویل تر اور دشوار گزار راستے کو اختیار کیا گیا گوالیار کی مرہٹہ ریاست اور ٹونک کی مسلم ریاست میں پذیرائی بھی ہوئی اور امداد بھی ملی۔ دس ماہ کا طویل سفر کرکے کوئٹہ کابل ہوتے ہوئے یہ قافلہ پشاور پہنچا۔ یہ انتظام بھی رکھا گیا کہ وسط ہند کے علاقوں سے کمک اور امداد مالی برابر پہنچتی رہے۔

۱۸۲۷ء میں عارضی آزاد حکومت کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ تمام اہل قافلہ نے سید احمد صاحب کو اپنا امیر مقرر کیا اور مختلف شعبہ ہائے نظام کے لیے مختلف افراد کو مقرر کیا گیا۔ تعاون و امداد کے لیے ایران افغانستان میں سفارتیں بھیجی گئیں۔ سفیروں کے ذریعے ہندوستان کے مختلف

کا حامل تھا۔ دور تک مسلم ریاستوں کا سلسلہ تھا، جن سے بڑی امداد ملنے کی توقع تھی۔ خود اس علاقہ کی آبادی ایسے قبائل پر مشتمل تھی جن کی حریت پسندی ضرب المثل تھی۔ لیکن پنجاب کی سکھ حکومت کے ہاتھوں ان کا ناک میں دم تھا پھر بھی وہ آپس میں ہی ایک دوسرے سے برسر پیکار رہنے کی وجہ سے اپنی قوتوں کو ضائع کرتے رہتے تھے ان کو متحد و منظم کر کے ایک ایسی عسکری قوت حاصل ہو سکتی تھی جس کے ذریعہ استخلاص وطن کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا تھا۔

زماں شاہ نے اٹھارویں صدی کے آخر میں ہندوستان پر یلغار کر کے پنجاب کے میدانوں کو روند ڈالا تھا۔ اس کے طوفان کو روکنا نہ مرہٹوں کے بس کی بات تھی، نہ تخت دہلی کی۔ اس کے قدم ایک بار دہلی میں جمتے تو انگریزوں کی پیش قدمی کے امکانات معدوم ہو جاتے لیکن اسی دوران افغانستان میں خانہ جنگی شروع کرا دی گئی اور زماں شاہ کو واپس جانا پڑا۔ وہ ۱۷۹۹ء میں واپس جاتے ہوئے رنجیت سنگھ کو پنجاب کی گورنری کا پروانہ لکھ کر دے گیا تھا۔ اس کے زوال کے بعد رنجیت سنگھ نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ارد گرد کی چھوٹی چھوٹی سکھ اور مسلم ریاستوں کو ختم کر کے بڑی سلطنت قائم کی اور مہاراجہ کا لقب اختیار کیا، انگریزوں نے اس حکومت کو اپنا حلیف بنا لیا اور اپنی تدبیر گری سے سکھوں کو پہلے سندھیا کے مقابلہ پر کھڑا کر کے مرہٹہ قوت کو کمزور کرایا اور پھر سکھ حکومت کا رخ شمال کے پٹھانوں کی طرف موڑ دیا تاکہ خود انگریز شمال مغرب کے خطرے سے بے نیاز ہو کر مفتوحہ علاقوں میں اپنی حکومت کو مستحکم کر سکیں۔

حریت پسندوں کے اس قافلے کا پنجاب سے گزر کر سرحدی علاقہ تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے راجستھان کے طویل تر اور دشوار گزار راستے کو اختیار کیا گیا گوالیار کی مرہٹہ ریاست اور ٹونک کی مسلم ریاست میں پذیرائی بھی ہوئی اور امداد بھی ملی۔ دس ماہ کا طویل سفر کر کے کوئٹہ کابل ہوتے ہوئے یہ قافلہ پشاور پہنچا۔ یہ انتظام بھی رکھا گیا کہ وسط ہند کے علاقوں سے کمک اور امداد مالی برابر پہنچتی رہے۔

۱۸۲۷ء میں عارضی آزاد حکومت کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ تمام اہل قافلہ نے سید احمد صاحب کو اپنا امیر مقرر کیا اور مختلف شعبہ ہائے نظام کے لیے مختلف افراد کو مقرر کیا گیا۔ تعاون و امداد کے لیے ایران افغانستان میں سفارتیں بھیجی گئیں۔ سفیروں کے ذریعے ہندوستان کے مختلف

علاقوں سے بھی رابطہ قائم کیا گیا۔ قائدین کے سامنے جہاد حریت سے بھی زیادہ ضروری تنظیم و اصلاح کا کام تھا۔ لیکن یہاں پہنچ کر ابھی سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ سکھوں کی فوجوں سے تصادم ہوگیا۔ بے سروسامانی کے باوجود شروع کی جنگوں میں کامیابی ہوئی۔ کافی علاقہ زیرنگیں آگیا۔ عشر کا نظام قائم کرکے مالیات کا بھی انتظام ہوگیا لیکن اس صورت حال سے اصل مقصد دور ہوتا جارہا تھا۔ مختلف والیان ریاست اور خاص طور پر سکھ حکومت کے ذمہ داروں کو جو خطوط اس دوران میں لکھے گئے اُن سے ان حضرات کا عندیہ معلوم ہوتا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی افواج کے جنرل بدھ سنگھ کے نام خط سے یہ چند سطور ملاحظہ ہوں۔

"خدا گواہ ہے کہ ہمارا منشا نہ دولت جمع کرنا ہے نہ اپنی حکومت قائم کرنا ہم خدا خدائے بالا و برتر کے ناچیز بندے ہیں، نہ بندگان خدا پر جبر و قہر کا کوئی وسوسہ ہمارے دل میں ہے اور نہ کسی کی حکومت چھین لینے کا کوئی جذبہ ہمارا منشا وطن کو آزاد کرانا ہے اور بس، اور یہ اس لیے کہ تقاضائے مذہب ہی ہے اور اسی میں رضائے مولا مقصود ہے"

سید صاحب کے منشا کی مزید تفصیل اس خط میں ہے جو گوالیار کے مرہٹہ سردار راجہ ہندو راؤ کو لکھا گیا۔ لکھتے ہیں:

"جناب کو خوب معلوم ہے کہ وہ بیگانے اور اجنبی جو وطن عزیز سے بہت دور کے رہنے والے ہیں دنیا جہاں کے بادشاہ بن گئے ہیں اور سودا بیچنے والے دوکاندار بادشاہت کے درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بلند مرتبہ رؤسا کی ریاست کو برباد کر دیا ہے اور ان کی عزت اور ان کا اعتماد بالکل ختم کر دیا ہے چونکہ وہ لوگ جو ریاست اور سیاست کے مالک تھے گوشۂ گمنامی میں بیٹھ گئے ہیں ناچار چند بے سروسامان فقیر کمر ہمت کس کر کھڑے ہو گئے۔ کمزوروں کی یہ جماعت محض اللہ کے دین کے تقاضے سے اس خدمت کے لیے کھڑی ہوگئی ہے یہ لوگ جاہ طلب دنیا دار نہیں ہیں بلکہ ایک مذہبی اور اخلاقی فرض سمجھ کر اس خدمت کے لیے اٹھے ہیں۔ مال و دولت کا قطعاً کوئی لالچ نہیں ہے۔ جس وقت ہندوستان کا میدان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے نشانے پر

پہنچ جائے گا۔ حکومت کے عہدے اور منصب ان کے سپرد ہوں گے جوان کے مستحق ہوں گے اور انھیں کی شوکت وعظمت کی جڑیں مضبوط کی جائیں گی ہم کمزوروں کو بڑے بڑے رؤسا اور بلند مرتبہ عمائدین سے صرف اتنی بات درکار ہے کہ اہل اسلام کو اُن کا دلی تعاون حاصل رہے اور مسندِ حکومت اُن کو مبارک ہو۔[۹]

اس علاقے کے بہت سے قبائل، جرگوں اور خوانین نے سید احمد صاحب کی امارت کو تسلیم کر کے بیعت کی چند ہفتوں کے اندر اندر ہی مجاہدین کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی[۱۰] سید صاحب کے ساتھ جو لوگ ایک عرصے سے رہ رہے تھے اور ان کے دامن تربیت میں کچھ دن زندگی گزار چکے تھے ان کے اندر للہیت، حق پرستی، صداقت شعاری، اخلاص، رضا بالقضا، صبر وتحمل اور ایثار و قربانی کے جذبات بدرجہ اتم پیدا ہو چکے تھے۔ لیکن ملکی خوانین میں سے سب نے صدقِ دل سے ساتھ نہیں دیا۔ اس جدوجہد کے پہلے ہی سال درانی سردار محمد خاں نے سکھوں سے سازباز کر کے اس مشن کو ناکام بنانے کا پورا بندوبست کر دیا۔ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے پشاور کا جاگزار حاکم تھا۔ بہ ظاہر اپنی آزادی کا اعلان کیا اور سید صاحب کے ساتھ شامل ہو گیا لیکن اس کی نیت صاف نہیں تھی۔ پہلے عین جنگ کے موقع پر سید صاحب کو زہر دلوا دیا۔ لنگڑا ہاتھی ان کی سواری کے لیے مہیا کیا اور پھر جب لشکر مجاہدین کو کامیابی حاصل ہو رہی تھی میدان جنگ سے اپنے بیس ہزار کے لشکر کو لے کر فرار ہو گیا جس سے افراتفری مچ گئی اور میدانِ جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ سخت نقصانات اٹھانا پڑے۔ اس طرح کی دغابازیوں کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ اس علاقہ کے لوگ اپنی حریت پسندی کی اعلیٰ صفت سے باوجود کسی ضبط وتنظیم کے عادی نہ تھے۔ جنگ جوئی اُن کی سرشت تھی لیکن عسکری نظم سے وہ بالکل بیگانہ تھے اسلامی اصولوں پر مبنی عدل وانصاف اور مساوات اور جمہوریت کا جو نظام سید صاحب قائم کرنا چاہتے وہ نہ ان کی طبیعت سے میل کھاتا تھا نہ ان کی خود غرضیوں کی تسکین کر سکتا تھا بلکہ اس سے اُن کے پندار وغرور کو ٹھیس پہنچتی تھی پھر انگریزوں نے بڑی چالاکی سے مذہبی اشتباہات پیدا کر دیے اور بہت سے خوانین اس لشکر مجاہدین سے بدظن ہو گئے یہاں تک کہ سازش کر کے ایک شب میں تمام علاقہ میں متعین منتظمین، عمال اور حکام کو قتل کرا دیا گیا۔ اس میں تقریباً چار ہزار جانیں ضائع ہوئیں اور یہ سب ہندوستان سے آئے ہوئے تربیت یافتہ حضرات تھے۔ سید صاحب کے پیغام کی مقبولیت کے

باعث قوت میں اضافہ بھی ہوا۔ لیکن ان عوارضات و موانعات کے نتیجہ میں یہ قوت ٹوٹتی رہی۔ پھر جو کچھ قوت مجتمع ہوئی وہ سب سکھوں کے ساتھ جنگ میں صرف ہوگئی۔ اور جب اہل سرحد کی ان غداریوں سے سخت بددلی اور مایوسی پیدا ہوئی تو سید صاحب نے ان علاقوں سے نکل جانے کا ارادہ کرلیا۔ اور مخلصین کی جماعت کو لے کر کوچ کیا بھاری آلات جنگ توپ وغیرہ کو چھوڑ دیا کیونکہ اب مقصد جنگ کرنا نہیں تھا۔ بلکہ دشوار گزار پہاڑی راستوں سے گزر کر کسی ایسے مقام پر پہنچ جانا تھا۔ جہاں اپنوں کی منافقانہ چالوں اور غداریوں سے محفوظ رہ سکیں لیکن رہبروں کی عیاری سے سکھوں کے بڑے لشکر گھِر گئے۔ اور بالاکوٹ کے مقام پر وہ آخری معرکہ در پیش آیا جس میں ۷ رمئی ۱۸۳۱ء کو سید صاحب اور اُن کے مخلص مرید مولانا محمد اسمٰعیل اور اُن سے بہت سے دیگر جانثاروں نے جام شہادت نوش کیا۔

خدا رحمت کند بر عاشقانِ پاک طینت را

اور ساری تحریک کا شیرازہ بکھر گیا۔

انگریز کی شاطرانہ چالیں کہیے یا حالات کی ستم ظریفی کہ سکھوں نے توسیع سلطنت کے جوش میں اپنی قوتیں پٹھانوں کو زیر کرنے میں صرف کر دیں۔ پٹھان اور حریت پسند مجاہدین سکھوں سے ٹکرا کر ختم ہوئے اور کچھ ہی عرصے بعد پنجاب بھی انگریزوں کے زیر نگیں آگیا اور صوبہ سرحد بھی یعنی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی ڈپلومیسی کا یہاں بھی اس طرح بھرپور مظاہرہ ہوا جیسے ہندوستان کی بہت سی چھوٹی بڑی دوسری ریاستوں کے ساتھ ہو چکا تھا۔

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ شاہ عبدالعزیز کی ہدایت کے مطابق سید احمد صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ۱۸۱۸ء سے ۱۸۲۵ء تک شمالی ہند کے مختلف علاقوں کے دورے کیے۔ اصلاح رسوم اور تبلیغ دین کے ساتھ عوام الناس میں آزادی کی رُوح پھونک دی۔ اس کے نتیجہ میں:

(۱) لوگوں کی بڑی تعداد سید صاحب کے ساتھ ان کی آزاد فوج میں شامل ہوگئی اور یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب سید صاحب سرحدی علاقہ میں مصروف پیکار ہوگئے۔ ہندوستان سے ہجرت کرکے اس لشکر میں شامل ہونے والوں کی تعداد کم و بیش آٹھ ہزار بتائی جاتی ہے۔

(۲) مالی امداد بھی ملک کے گوشے گوشے سے حاصل ہوتی رہی۔

(۳) ملک کے مختلف علاقوں میں ایسے افراد تیار ہوگئے جنھوں نے آگے چل کر حریت پسندوں